ڈاکر منور ہاشمی*

میر تعشق مرثیے کے تیسرے دبستان کا سب سے بڑا شاعر

Abstract: *Normally there are two schools of thoughts more famous in Urdu Elegy i.e. "Dabistan-e-Anees" and "Dabistan-e-Dabeer". There is no doubt that both these Schools of Thoughts played very important role in popularization of Udu Elegy but at the same time, it would be an injustice when 3rd school of thought is not mentioned with regard to Urdu Elegy. Meer Taa'ashuk stood Herald of 3rd School of Thought. Though a large number of renowned poets appear to be the followers of this 3rd Dabistan. However, the biggest poet of this Dabistan was Meer Taa'ashuq who happened to be a younger brother of Meer Ishq. It is he who included the colours as well as tone of Ghazal into elegy and also extended Elegy to discuss issues of the normal life. This style of the elegy stood a fame of this Dabistan. That is why this Dabistan is distinguishable and unique in nature in comparison to other two Dabistans. There is no exaggeration found in poetic work of Meer Taa'ashuq owing to the fact that he had spend a major part of his life in Karbala-e-Moallah due to which his poetry depicts a real colour of the scenic art. Whereas the poetry of Anees and Dabeer lacks this colour. By all ways, a unique style and spiritual effect of Meer Taa'ashuq became a cause of extension and popularity of the topics included in Urdu elegy. Without mentioning of Meer Taa'ashuq, history of Urdu elegy is incomplete.*

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرثیے کے آغاز و ارتقا میں دو دبستانوں کا حصّہ ہے۔ ایک دبستان انیس اور دوسرا دبستان دبیر۔ دبستان انیس میں انیس کے بعد ان کے تتبع میں مرثیے لکھنے والوں کے علاوہ انیس سے پہلے ان کے آباو اجداد بھی شامل ہیں۔ ان کے خاندان میں بڑے بڑے مرثیہ نگار پیدا ہوئے۔ اس طرح جب بھی مرثیے کے حوالے سے بات ہو گی میر انیس اور ان کے خاندان کو سب سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ برصغیر میں مرثیے کے فروغ میں جو کردار اس خاندان نے ادا کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔

*شعبہ اردو وفاقی اردو یونیورسٹی۔ اسلام آباد

بقول ڈاکٹر ماجد رضا عابدی:

" خاندان میر انیس کی آٹھ پشتوں نے زبان کو سنوارنے میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ دینا کی کوئی بھی زبان اپنے محسنوں کی آٹھ پشتیں پیش کرنے سے قاصر ہے اور اردو زبان میں بھی یہ واحد مثال ہے کہ جہاں آٹھ پشتوں تک مستقل مزاجی کے ساتھ ایک ہی فن یعنی مرثیہ گوئی کی ترویج و ترقی میں حصّہ لے کر اسے معراجِ کمال تک پہنچادیا جائے۔"(۱)

میر انیس کے آبا کی خدمات سے کسی طور انکار ممکن نہیں اسی طرح میر انیس کے حلقہ اثر میں رہنے والے شعرا نے بھی مرثیے کو با قاعدہ صنفِ ادب کے طور پر تسلیم کرانے میں اہم کردار اور کیا۔ مرثیے کی تسلسل کے ساتھ تخلیق اور اس میں زندگی کے مختلف مضامین کی شمولیت ہی اس کی ترقی اور ترویج کا باعث بنی۔ میر انیس اس حوالے سے ایک مکمل دبستان کے سربراہ ہیں جس دبستان نے مرثیے کو موجودہ دور تک پہنچانے میں اپنی کوششوں کو آگے بڑھایا۔ اس دبستان میں ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ ساتھ دیگر قابلِ ذکر شعرا بھی شامل ہیں تاہم ان شعرا نے میر انیس سے ہٹ کر مرثیے میں ہیئت یا مضامین کے حوالے سے کوئی خاص اضافہ نہیں کیا انیس کی پیروی کو ایک فرض منصبی سمجھ کر نبھایا۔

بقول ڈاکٹر طاہر کاظمی:

"مجموعی طور پر دبستانِ انیس نے کثرت سے انیس کے طرزِ بیان کی پیروی کی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے وہ اپنی امتیازی حیثیت اسی بنا پر قائم نہ رکھ سکے۔ انہوں نے مرثیہ نگاری میں کوئی نئی راہ یا روش اختیار نہیں کی۔ انیس و دبیر کے مرثیہ نگاری میں اپنائے گئے عناصر یا موضوعات پر ہی ان کی طبع آزمائی کا دارومدار رہا ہے۔" (۲)

جہاں تک دبیر اور ان کے دبستان کا تعلق ہے اس کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرثیے کے فروغ اور ارتقا میں ان کا کردار بھی کسی طرح کم نہیں۔ دبیر کے آباو اجداد میں اگرچہ کوئی مرثیہ گو دکھائی نہیں دیتا مگر انہوں نے اپنے اخلاف اور پیروکاروں میں مرثیہ نگاروں کی ایک فوج ظفر موج چھوڑی۔ دبیر کا دبستان مرثیہ اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں شامل شعراء کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اوج لکھنوی، شاد عظیم آبادی اور صغیر بلگرامی جیسے نامور شعرا اسی دبستان کے فیض یافتہ ہیں۔ ان شعرا نے انیس اور دبیر کے روایتی انداز سے کسی حد تک گریز بھی کیا جس کے باعث انہیں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔

بقول ڈاکٹر طاہر کاظمی:

"دبیر کی مرثیہ نگاری کا اثر محدود نہیں تھا بلکہ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ان کی طرز پر مرثیہ کہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔۔۔ دبستانِ دبیر کے شعرا نے مرثیہ نگاری کو وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر نئے موضوعات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔" (۳)

انیس اور دبیر کے دبستان ہائے مرثیہ کا ڈنکا پورے برصغیر میں بج رہا تھا۔ علمی و ادبی دنیا میں وہ اپنی مثال آپ بنے ہوئے تھے۔ شعرا کی اکثریت ان کی پیروی کو اپنی بقا کا سبب سمجھتی تھی۔ مگر اسی عہد میں انہی دبستانوں کی موجودگی میں مرثیہ گوئی کا ایک اور چراغ بھی روشن ہوا جس چراغ سے بہت سے مزید چراغ جلے اور ایک تیسرا دبستانِ مرثیہ وجود میں آیا۔ جس کے نقیب سید حسین میر زا عشق تھے۔ اس دبستان کی خدمات اس لیے اہم ہیں کہ اس کے ارکان نے مرثیہ میں روائتی مضامین کی بجائے جدّت پسندی کا مظاہرہ کیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر جن کا خیال تھا کہ ان کے سامنے کسی اور کا چراغ جل ہی نہیں سکتا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چراغ بھی جلا اور اس کی روشنی محدود بھی نہیں رہی۔ اس دبستان کے اثرات آج کے عہد تک دیکھے بھی جاسکتے ہیں۔ میر عشق میر زا انس کے بڑے فرزند تھے۔ ان کے خاندان میں شاعروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اسی حساب سے ان کے شاگرد بھی کم نہیں تھے تاہم عشق نے ایک نئی طرز مرثیہ کا آغاز کیا۔

بقول مرزا امیر علی جونپوری:

"عشق کے مرثیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ایک لفظ انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑا ہے۔ سوچ سوچ کر چلے ہیں۔ سلاست، فصاحت کی وہی شان ہے جو باپ دادا کے کلام میں ہے۔" (۴)

عشق اور ان کے تلامذہ کے مرثیے انیس اور دبیر کے رنگ سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں انہوں نے کسی سطح پر بھی مرثیے کے معروف دبستانوں کی پیروی کرنا مناسب نہیں سمجھا اسی وجہ سے وہ ایک الگ دبستان کہلانے کے سزاوار ہیں۔

بقول شمشاد حیدر زیدی:

"عشق نے اپنے آپ کو میر انیس سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ ان میں قوت اور اظہار دونوں کی کمی نہ تھی۔ وہ میر انیس کی طرح استعاراتی اور پیکری ذہن تو نہ رکھتے تھے لیکن جزئی صورتحال کا احاطہ محض بیانیہ کے بل بوتے پر کر لیتے تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ قید و بند اختراع کیے اس لیے ان کے ایک الگ دبستان کا ذکر کیا جاتا ہے۔" (۵)

عشق امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ دبستانِ عشق کی بنیاد اگرچہ عشق نے رکھی۔ مگر اس دبستان کو طاقتور اور مقبولِ عام بنانے میں ان کے چھوٹے بھائی سید میر زا تعشق کا زیادہ عمل دخل ہے۔ تعشق بھی ناسخ کے شاگرد تھے۔ ناسخ چونکہ اصلاح زبان کے علمبر دار تھے۔ اس لیے عشق اور تعشق دونوں نے مرثیے میں اس تحریک کو جاری و ساری رکھا۔ تعشق 1823ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ اور اسی شہر ہی میں 1891ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ تعشق محض شاعر ہی نہیں تھے ایک خدامست، فقر پسند اور روحانی شخصیت بھی تھے۔ امام بخش ناسخ کے ساتھ ساتھ اپنے والد بزر گوار میر زا انس لکھنوی سے بھی فیض حاصل کیا۔ تعشق ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ فصاحت و بلاغت میں انیس و دبیر بھی ان کے مقابل نہیں ٹھہرتے تھے۔ مگر عوامی شہرت کے حصول کا شوق چونکہ ان میں نہیں تھا۔ اس لیے کسی سے مقابلہ کرنا بھی انہیں پسند نہ تھا۔ شاعری کا آغاز تعشق نے غزل گوئی سے کیا۔ ان کی غزل بھی اپنا جواب آپ ہے۔

بقول ابر لکھنوی:

> "غزل گوئی کم کی تاہم جس قدر بھی حصّہ غزلیات کا ہے وہ کمیاب نہیں بلکہ نایاب زمانہ ہے۔ حسنِ اتفاق اور اردو ادب کی خوش قسمتی ایک مجموعہ آپ کے کلام کا دستیاب ہو گیا جس کو پیش کر کے میں بجائے خود نازاں ہوں کہ اگر کوئی مجھ سے اردو کی خدمت ہو سکی ہے تو وہ یہی ہے کہ میں اس کلام کو پردہ اخفا سے باہر لایا۔ جس پر لکھنو کی اردو شاعری کو فخر و ناز ہے۔" (۶)

تعشق کی غزل بلاشبہ لاجواب ہے اور بالکل جدید رنگ لیے ہوئے آج کی غزل محسوس ہوتی، چند اشعار دیکھئے :

دل جل کے رہ گئے ذقنِ رشکِ ماہ پر
اس قافلے کو پیاس نے مارا ہے راہ پر

کہتے ہو کس کے قلب میں اُٹھتا ہے شب کو درد
روتا ہے دل مرا ،مرے حال تباہ پر (۷)

.....

یاد کیں نشہ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کس کی
غش تجھے اے دلِ بیمار چلے آتے ہیں

راہ میں صاحب اکسیر کھڑے ہیں مشتاق
خاکسارانِ درِ یار چلے آتے ہیں (۸)

.....

ہم وہ عریاں ہیں کہ واقف نہیں اے جوشِ جنوں
نام کس شے کا گریبان ہے، دامن کیسا

کہ دیا بس کہ تری آہ میں تاثیر نہیں
یہ نہ دیکھا کہ یہ سینے میں ہے روزن کیسا(۹)

.....

تعشق کی غزل اپنے اندر انفرادیت اور نفاست رکھتی ہے۔ اس میں نزاکتِ احساس اور جدّتِ مضامین کی وجہ سے جو خوبصورتی نظر آتی ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ ان کی شاعری کا یہ حسنِ تغزل بعد میں ان کے مرثیہ میں ظاہر ہوا۔ اس کے علاوہ جو مضامین غزل میں عموماً انہوں نے شامل کیے وہ بھی مرثیے میں در آئے جس سے ان کا مرثیہ ایک انفرادی شان کے ساتھ سامنے آیا اور پھر یہ دبستانِ عشق کی پہچان بن گیا۔

بقول ڈاکٹر جعفر رضا:

> "تعشق کے مرثیوں کی بڑی خصوصیت ان کا تغزل آمیز پیرائیہ بیان ہے انہیں خود بھی غزل کے مضامین سے بڑی دلچسپی تھی جس کا ثبوت ان کا انتخاب تخلص بھی ہے۔" (۱۰)

انہوں نے میر انیس اور مرزا دبیر کے اندازِ مرثیہ گوئی سے بغاوت کی ہے۔ ان کے بنائے ہوئے سانچے کو اپنے کلام کے لیے موزوں قرار نہیں دیا بلکہ اس ہیئت میں رہتے ہوئے مضامین کے سانچے تبدیل کیے۔ عصر رواں کے معاشرتی مسائل کو مرثیے میں جگہ دی۔ فلسفیانہ موضوعات بھی ان کے مرثیے کی شان میں اضافہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رومانی فضا بھی ان کے مرثیے میں اکثر مقامات پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہجر و وصال کا تذکرہ بھی بے تکلفانہ کرتے تھے۔ شمشاد زیدی اپنے موضوع "اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات" میں لکھتے ہیں ہیں: "انہیں نفیس مضامین اور لطف بیان سے عشق تھا، تعشق کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے تغزل اور مرثیت دونوں کو ملا کر ایک ایسا ہر دلعزیز رنگ اختیار کیا جو آج تک پسندیدہ ہے لیکن امتزاج سے مرثیت میں کوئی فرق نہیں آیا وہ واقعاتِ کربلا کو تغزل کی عینک سے دیکھتے ہیں اسی وجہ سے ان کے رزم میں بزم کا عنصر تھا۔"

تعشق کی مرثیہ گوئی انیس اور دبیر کے زمانے میں اگرچہ زیادہ چمک کر سامنے نہیں آئی، مگر وہ اور ان کا دبستانِ مرثیہ اپنا کام بہر حال کرتا رہا اور علمی و ادبی دنیا میں اپنے نقوش ثبت کرتا رہا۔ تعشق اپنی انفرادیت، جدّت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بعض مقامات پر میر انیس سے بھی دو قدم آگے تھے اور اس امر کو میر انیس خود بھی تسلیم کرتے تھے۔ بقول محمد حسین آزاد:

"آپ کی خداداد طبیعت نے مرثیہ میں غزل کا ہر دلعزیز رنگ ایجاد کیا جس مشاعرے میں پڑھ دیتے تھے، سننے والے بے تاب ہو جاتے اور بے اختیار داد دیتے تعشق اور انیس کے برادرانہ تعلق اس حد تک تھے کہ انیس اکثر اپنا نیا مرثیہ آپ کو سناتے تھے۔" (۱۱)

اب نمونے کے طور پر تعشق کا مرثیہ دیکھئے جس میں انہوں نے حسنِ تغزل کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیش کر دیا ہے۔

سچ ہے دنیا میں شبِ ہجر بلا ہوتی ہے
دم بدم آرزوئے مرگ سوا ہوتی ہے
آہ ، سینے کے لیے تیر جفا ہوتی ہے
دل جلاتی ہے جو ٹھنڈی بھی ہوا ہوتی ہے

زندگی کہتے ہیں دنیا سے گزر جانے کو
دل تڑپتا ہے گلا کاٹ کے مر جانے کو (۱۲)

اس طرح کے مضامین تعشق کے مرثیے میں جابجا ملتے ہیں جو مرثیے کو ایک چاشنی اور جدّت سے آشنا کرتے ہیں۔ تعشق جہاں رزمیہ واقعات کو نظم کرتے ہیں وہاں تغزل میں کمی آجاتی ہے۔ لیکن جدّت اور حسن بیان میں کمی نہیں آتی۔ میر انیس کو حسنِ ادا کا شہنشاہ سمجھا جاتا ہے مگر تعشق کے مرثیے میں یہ خصوصیت حیرت ناک طور پر بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مرثیہ ملاحظہ فرمائیں :

بہتی تھی نہر خون کی دریا کے سامنے
لالہ کھلا تھا سبزہء صحرا کے سامنے

پھرتی تھی مرگ لشکرِ اعدا کے سامنے
آیا جو کوئی سیدِ والا کے سامنے

سینے میں جا کے تیغ دوپیکر نکل گئی
پہلو سے روح آنکھ بچا کر نکل گئی (۱۳)

اس بند میں چوتھے اور پانچویں مصرعے کا ربط ملاحظہ کریں۔ اسی طرح سارے مرثیے ہیں۔ ایسا پیرائیہ اظہار مرثیے میں کہیں اور نظر نہیں آتا تاہم شہرت اور چیز ہے اور عظمت دوسری چیز، تعشق بہت وضع دار انسان تھے ان کے عہد میں میر انیس، مرزا دبیر اور ان کے بڑے بھائی میر عشق موجود تھے۔ میر عشق کا تیسری قوت کے طور پر چرچا ہو رہا ہے۔ اس دوران میں میر تعشق ایک نئی سج دھج سے ایک

اعلیٰ پائے کے مرثیہ نگار کی حیثیت سے ظاہر ہوئے مگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ بڑے بھائی کی موجودگی میں انہیں اپنا نام پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں وہ اس بات کو محسوس نہ کر جائیں لہٰذا اس سوچ کے ساتھ وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے اور وہاں اپنی آنکھوں سے تمام مقامات دیکھے اُن مقامات کی دید سے ان کی آنکھوں کے سامنے سانحہ کربلا کے تمام مناظر آتے رہے اور وہ مرثیہ گوئی میں مصروف رہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کربلا آئے تھے اور چند سال بسر کیے اب تو وہ لمبی مدت کے لئے قیام پذیر ہوئے اور بڑے بھائی کی وفات کے بعد لکھنو واپس گئے، زندگی کا ایک بڑا حصّہ کربلائے معلیٰ میں بسر کرنے کی وجہ سے ان کے کلام میں حقیقی عقیدت اور جذبوں کی شدّت ملتی ہے۔ میر انیس اور دبیر کا مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے لکھنو کے باہر قدم نہیں رکھا۔ ان کے ہاں ہمیں جو فطرت نگاری نظر آتی ہے وہ بھی محض ایک پنسل اسکیچ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ دونوں نے فطرت کے مناظر اور مظاہر اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھے اس کے برعکس میر تعشق نے فطرت کا خود مشاہدہ کیا اور ان مقامات پر کیا جہاں سانحہ کربلا پیش آیا۔ اس لیے ان کے کلام میں فطرت اپنے تمام تر جلووں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ گرمی کی شدت کا اظہار تعشق کے مرثیے میں دیکھئے۔

ان گرمیوں میں قافلے چلتے ہیں بہت کم
جھیلوں میں پڑے ہیں یہ پرندوں کا ہے عالم
دریا کی ترائی میں ٹھہر جائے کوئی دم
کچھ دور نہیں تجھ کو یہاں دیکھتے ہیں ہم
اس دھوپ میں دریا کی ہوا کھا نہیں سکتے
وجہیں بہت ایسی ہیں کہ ہم جا نہیں سکتے (۱۴)

تعشق کے مرثیے میں جذبات اور عقیدت دونوں موجود ہیں مگر مبالغہ آرائی نہیں ملتی عموماً شاعر مبالغہ آرائی وہاں کرتا ہے جہاں اس کا کسی سے مقابلہ ہو۔ تعشق ایک درویش صفت انسان تھے کسی سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے اشعار دوسروں کو دے دیا کرتے تھے اور کبھی خود اپنے اشعار دوسروں کے نام سے پڑھ دیا کرتے۔ تعشق نے زیادہ نہیں لکھا مگر بہت اچھا لکھا ہے۔ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک بڑے شاعر اور بڑے مرثیہ نگار کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ آخر میں ان کے مرثیے کے بند جن میں فلسفیانہ مضامین بیان کیے گئے۔

اللہ رے اس عمر دوروزہ کی روانی
یہ قالبِ خاکی تو لحد کی ہے نشانی

سچ ہے کہ گزر گاہ ہے یہ منزلِ فانی
پیری نہ رہے گی نہ رہا عہدِ جوانی

سب کیفیتیں بھول گئیں صبح وطن کی
بالوں میں سفیدی نظر آتی ہے کفن کی

کس وقت میں بے کس کی ملاقات کو آیا
رنگت کا عجب حال ہے کیا رنج اٹھایا

رستے میں ٹھہرنے کو ملا تھا کہیں سایا
اچھا تو ہے! کچھ منہ ترا اترا ہوا پایا

گرمی ہے زیادہ نہ کہیں بدمزگی ہو
منگواوں میں پانی جو تجھے پیاس لگی ہو (۱۵)

حوالہ جات:

۱۔ عابدی، ماجد رضا، ڈاکٹر، کلامِ میر انیس مضمون مشمولہ خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا مرتب ضمیر نقوی، کراچی، مرکزِ علوم اسلامیہ، دوسرا ایڈیشن 2012ء، ص،28

۲۔ کاظمی، طاہر حسین، ڈاکٹر، مرثیہ انیس کے بعد، دہلی، اردو اکادمی، 1997ء، ص30

۳۔ ایضاً ص31

۴۔ مرزا امیر علی جونپوری، تذکرہ مرثیہ نگارانِ اردو، لکھنو، سرفراز پریس، 1985، ص361

۵۔ شمشاد حیدر زیدی، اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان 2009ء، ص138

۶۔ ابر لکھنوی (مرتب) دیوانِ حضرت تعشق لکھنوی، لکھنو شام اودھ پریس (س۔ن) ص3

۷۔ تعشق لکھنوی، دیوانِ حضرت تعشق (مرتبہ ابر لکھنوی) لکھنو، شام اودھ پریس (س۔ن) ص13

۸۔ ایضاً ص17 ۹۔ ایضاً ص8

۱۰۔ جعفر رضا، ڈاکٹر، دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی، الہ آباد، نیشنل کتاب گھر 1983ء، ص236

۱۱۔ آزاد، محمد حسین، دیباچہ، براہین غم (تعشق لکھنوی)، لکھنو صادق پریس 1927ء، ص3

۱۲۔ تعشق لکھنوی، براہین، غم، لکھنو، صادق پریس 1927ء، ص27

۱۳۔ ایضاً ص91 ۱۴۔ ایضاً ص8 ۱۵۔ ایضاً ص9

☆☆☆☆☆